پروفیسر سیّد احتشام حسین

مقدّمہ

مرثیہ — معراجِ فکر

اردو مرثیے کی فنی تاریخ طرز اظہار کے تعین کی تاریخ بھی کہی جاسکتی ہے، کیونکہ ابتدائی دور کے مرثیوں میں جہاں مواد اور موضوع کو سرسری حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، وہیں اس کی ہیئت اور ظاہری ساخت کی جانب سے بھی بے اعتنائی برتی گئی تھی، لیکن جب ایک بار ہیئت کا مسئلہ حل ہوگیا اور اہم ترین مرثیہ نگاروں نے مسدس کو مرثیہ نگاری کے لیے مخصوص کردیا تو موضوع کی وسعت پر بھی نظر گئی کیونکہ مسدّس محض اظہار تاثر کے لیے موزوں نہ تھا، بلکہ واقعات اور خیالات کے پھیلاؤ کا مطالبہ کرتا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے قدیم مرثیہ نگاروں نے مرثیے کو واقعہ کربلا اور غم امام حسینؑ کے اظہار کا آلہ کار قرار دیا تھا۔ وہ زیادہ تر رونے رلانے کے لیے امام حسینؑ کی شہادت اور مصائب کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے تھے اور عقیدت و ارادت کا سہارا لے کر شاعری کے فنی پہلوؤں سے بے نیاز ہوجاتے تھے۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر مرثیہ گوئی فن ہے اور مرثیہ اصنافِ شعری میں سے ایک صنف ہے تو شاعر محض یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہوسکتا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق اظہار غم و الم سے ہے، شاعری سے نہیں ہے۔ اس خیال سے سوداؔ نے شعوری طور پر مرثیے کی فنی اصلاح پر زور دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بعد سے مرثیے نے اہم ادبی حیثیت اختیار کرلی اور غزل، قصیدہ، مثنوی کی طرح اسے بھی بلند پایہ اور اہم اصناف میں جگہ دی گئی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فنی ارتقا کے ساتھ ساتھ مرثیے کی معنوی حیثیت بھی بلند ہوگئی۔ مرزا رفیع سوداؔ کے مرثیوں میں اس وقت تک تمام

دوسرے مرثیہ گویوں کے مقابلے میں زیادہ جان ہے۔

سوداؔ نے مرثیے میں اصلاح کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ اصلاح کی منزل سے گزر کر تعمیری حسن کی منزل تک پہنچا، اور سوداؔ کے فوراً بعد آنے والے مرثیہ گویوں نے واقعہ کربلا کی عظمت کے احساس کو اعلیٰ ترین فنّی روپ دینے کی کوشش کی۔ خلیقؔ، ضمیرؔ اور فصیحؔ کے مرثیے اس کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ اس دور میں اور ان فن کاروں کے ہاتھوں مرثیے کے خط و خال واضح ہونے لگے اور اس کی شاعرانہ خصوصیات پر توجہ کرنے کے ساتھ اس حادثہ عظیم کے واقعاتی پہلو بھی سامنے آنے لگے۔ یہ اودھ میں شیعیت کے فروغ کا زمانہ تھا۔ مرثیے کے لیے مناسب فضا موجود تھی۔ مرثیہ نگاری اہم شاعرانہ خدمت سمجھی جاتی تھی۔ مرثیہ خواں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ امیر و غریب، عالم اور جاہل سب مرثیوں سے تاثر حاصل کرتے تھے اور چونکہ اُس وقت تک مجالس میں حدیث خوانی کا بہت زیادہ فروغ نہیں ہوا تھا اس لیے مرثیہ خوانی ہی کو اہمیت حاصل تھی۔ صورت حال یہ تھی جب میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور بعض دوسرے شعراء نے مرثیہ کو ئی اور مرثیہ خوانی کے وزن و وقار میں غیر معمولی اضافہ کیا، جہاں تک مرثیے کے مرثیہ ہونے کا تعلق ہے اس کی ہیئت کی تکمیل ہوگئی بلکہ شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ بہار و خزاں کے ذکر، ساقی نامہ، گھوڑے اور تلوار کی تعریف جیسے عناصر نے آرائش و زیبائش کا وہ سامان بھی مہیا کر دیا جس کے نہ ہونے سے مرثیے کے بنیادی تصور میں کوئی کمی نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ آج بھی مرثیے کے نام سے جو نظمیں واقعہ کربلا کے متعلق لکھی جا رہی ہیں ان کے لیے مسدّس ہی کا استعمال ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہیئت بیانیہ تاثیراتی اور فکری ہر رنگ کے لیے مناسب ہے اور چونکہ تحت اللفظ خوانی میں بھی مسدّس سے مدد ملتی ہے اس لیے ہر وہ مرثیہ جو اس طرح پڑھنے کے لیے لکھا جاتا ہے، مسدّس ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مرثیے کی یہ معین ہیئت ہے، مرثیہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے مرثیہ ہوتا ہے۔ اسے کسی شکل میں لکھ سکتے ہیں لیکن عملاً اس کی یہی شکل سب سے زیادہ کارآمد اور کامیاب معلوم ہوتی ہے، اسی وجہ سے دورِ جدید کے شعرا نے بھی اس ہیئت کے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے شاگرد اور متبعین تو مرثیہ مسدس کی شکل میں لکھتے ہی رہے، دوسرے شعرا نے بھی یہی روش جاری رکھی۔ موجدؔ سرسوی،

جعفر علی خاں اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، آل رضا لکھنوی، فارغ بخاری، زائر سیتاپوری، ناصر زیدپوری، نجم آفندی اور بعض دوسرے شعراء جو اپنے اپنے نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور جو غالباً کلاسکی مرثیہ نگاری کا تتبع باقاعدہ نہیں کرتے، مرثیہ لکھتے وقت مسدس ہی کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس طرح مرثیہ کی ظاہری شکل کا مسئلہ اس وقت شعراء کے لیے الجھن کا سبب نہیں ہے لیکن موضوع اور مواد کی پیش کش کا مسئلہ ضرور غور وفکر کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کلاسکی مرثیوں میں جن عناصر کو تقریباً ترتیب وار پیش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، موجودہ شعراء بعض وجوہ سے اس کی پیروی نہیں کررہے ہیں۔ محض بیانیہ انداز نظر کی جگہ تاثراتی اور فکری انداز نظر پر زور دیا جارہا ہے اور ہیئت سے زیادہ معنویت پر۔ یہ بھی دورِ جدید کے تقاضوں کا نتیجہ ہے جس طرح حدیث خوانی اور ذاکری کا طرز بدلا ہے، روایت میں درایت کی آمیزش ہوئی ہے، خطابت میں استدلالی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی طرح مرثیہ گوئی میں بھی تغیر ہوا ہے۔ مرثیہ نگار وقت کی آواز پر کان دے رہا ہے اور فن کے تقاضوں کے اندر ہی اندر جذبات عقیدت میں حقائق کی آمیزش کر رہا ہے۔

ممکن ہے حضرت نجم آفندی کے نو تصنیف مرثیہ ''معراج فکر'' سے پوری طرح لطف اندوز ہونے میں بعض حضرات کو ان چند تمہیدی سطروں سے کچھ مدد ملے، کیونکہ یہ مرثیہ بھی ظاہری ساخت میں قدیم کلاسکی مرثیوں سے مشابہت رکھنے کے باوجود مختلف ہے۔ یہ اختلاف کہاں ہے اور کیوں؟ اس کی جستجو شاعر کے مزاج، وقت کے بدلے ہوئے انداز، واقعۂ کربلا کی جدید تشریح و تعبیر، مقصد مرثیہ نگاری اور سامعین کے ذوق وشعور کی روشنی ہی میں کی جاسکتی ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے اس مجلس میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا جس میں جناب نجم آفندی نے یہ مرثیہ ایک بڑے مجمع کے سامنے پیش کیا تھا، اس لیے یہ دیکھنے کا موقع بھی ملا کہ سامعین پر اس کا ردعمل کیا ہوا، اس کے کون سے حصے زیادہ پسند کیے گئے، کن بندوں پر زیادہ داد ملی اور واہ واہ، سبحان اللہ کے پردے میں کس قسم کے جذبات کا اظہار کیا گیا۔ پھر میں نے اس کو تنہائی میں غور سے پڑھا تاکہ اس فوری اور وقتی تاثر سے الگ ہوکر رائے قائم کرسکوں، جو اسے خود شاعر کی زبان سے سن کر ہوا تھا۔ اس سے قبل میں نجم آفندی کے قصائد، نوحہ جات، نظمیں، غزلیں، قطعات، بعض نثری تصانیف بھی

دیکھ چکا ہوں۔ انھوں نے 'فتح مبین' کے نام سے جو مرثیہ تقریباً پندرہ سال پہلے لکھا تھا، وہ بھی میری نظر سے گزر چکا ہے۔ اس لیے اس مرثیہ کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے وقت میرے پیش نظر وہ مجموعی تاثر بھی ہے جو میں نے ان کی شاعری اور شخصیت کے متعلق قائم کیا ہے، اور وہ کیف بھی جو 'معراج فکر' کے مطالعہ سے حاصل ہوا ہے۔

جناب نجم آفندی دور جدید کے ان شعراء میں سے ہیں جنھیں بجا طور پر استادی کا مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی عمر ریاض سخن میں بسر ہوئی ہے۔ تقریباً پچاس سال سے ان کی شاعری پر ان شعراء کی صحبتوں میں جلا ہوتی رہی ہے جن میں سے ہر ایک خود اردو شاعری میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ انھوں نے بچپن ہی سے اکبر آباد (آگرہ) کی علمی اور ادبی مجلسوں میں شریک ہوکر زبان و بیان کے لطیف مسائل پر غور کیا اور انھیں برتا ہے۔ اپنے والد مرحوم کے استادانہ رنگ سے کسب فیض کرنے کے علاوہ انھوں نے اساتذہ کا کثرت سے مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں ابتداء ہی سے ایسی پختگی اور ہمواری پیدا ہوگئی ہے جو بڑے ریاض کا نتیجہ کہی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی شاعر کتنے ہی سرچشموں سے فیض اٹھائے اس کے کلام میں زور، تازگی، جدت، گرمی اور سرمستی کے عناصر اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتے جب تک کہ وہ مسائل اور واقعات پر اپنے مخلصانہ نقطۂ نظر سے غور نہ کرتا ہو۔ یہ بات صرف مذہب کے لیے نہیں، زندگی کے ہر پہلو کے لیے صحیح کہی جاسکتی ہے کہ اس میں ''عقیدے'' کی آگ کا ہونا ضروری ہے ورنہ اس کا اظہار مصنوعی اور بے روح ہوگا۔ یہی ایک اچھے فن کار کی پہچان ہے کہ اس کا موضوع ہی اس کی زندگی اور روح ہو، اس کا بیان اس کے خلوص قلب کا آئینہ ہو، اور اس کے خیالات و تصورات کی گرمی اس کے الفاظ اور فقروں سے پھوٹی پڑ رہی ہو۔ نجم آفندی کی ساری شاعری میں یہ خصوصیت اس شدت سے نمایاں ہے کہ ان کے چند اشعار کا مطالعہ بھی ان کے جوش عقیدت کی غمازی کرنے لگتا ہے۔ ان کی مذہبی نظموں میں یہ بات ہر ہر لفظ سے نمایاں ہوتی ہے، لیکن وہی اس بات کا پتہ بھی دیتی ہے کہ اس والہانہ عقیدت کی بنیاد گہرے شعور اور استدلالی تیقن پر ہے۔ اندھی عقیدت اپنی نیک نیتی کے باوجود سطحی اور ہلکی ہوتی ہے۔ عقیدے کا عرفان گہرائی، شدت اور قوت پیدا کرتا ہے، یہی وہ منزل ہے جو نجم آفندی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کا عقیدہ علم و عرفان کا آفریدہ

ہے۔ ان کا یقین ادراک وشعور کا پیدا کردہ ہے، اس لیے ان کی شاعری میں ان کی روح کی آواز سنائی دیتی ہے جسے ان کی جدت طراز طبیعت ایک ایسے زاویے سے پیش کردیتی ہے جس پر دوسروں کی نگاہ نہیں گئی تھی۔

واقعۂ کربلا کے کچھ تاریخی پہلو ہیں، کچھ اعتقادی وجذباتی، کچھ ایسے ہیں جن میں عالم انسانیت کے لیے پیام روح اور درس اخلاق ہے، بعض پہلو ایسے ہیں جن میں شدید المیہ عناصر موجود ہیں اور بلا قید مذہب وملت انسان کے جذبات کو جھنجھوڑ دیتے ہیں۔ شعراء نے ان تمام پہلوؤں سے کام لیا ہے۔ جناب تجمّ آفندی نے بھی اپنے اندازِ نظر کے مطابق انھیں ''معراج فکر'' میں جگہ دی ہے لیکن ان کا نقطۂ نظر واقعات سے متعلق جذبات کے انتخاب سے ظاہر ہوجاتا ہے اور انھیں دوسرے شعراء سے امتیاز بخشتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں زیرِ نظر مرثیے پر نگاہ ڈالی جائے تو صرف اس بات کی ضرورت ہوگی کہ ہر موقع اور ہر تصور سے متعلق مثالیں فراہم کردی جائیں لیکن شاید اس طرح اس مختصر مرثیے کے زیادہ تر بند مقدمے ہی میں جگہ پاجائیں گے کیونکہ اس کا انداز بیانیہ نہیں فکری ہے اور واقعات کے بیان کا مقصد شہادتِ حسینؑ کے کسی مخصوص پہلو کی تشریح ہے۔ اس مرثیے میں جناب تجمّ کے پیشِ نظر امام حسینؑ، ان کے اعزاء اور احباب کی شہادت کا دل دوز بیان نہیں ہے بلکہ ان کی جانب ہلکے ہلکے اشارے کرکے ان سے وہ نتائج اخذ کرنا ہے جو آج کے انسان کے لیے فکر و عمل کا سنگم بن سکتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو ایک ہی بند کے اندر اتنے خیال انگیز اشارے جمع کردیے گئے ہیں کہ ان کی تشریح میں کئی کئی ورق سیاہ کیے جاسکتے ہیں۔ ایسا صرف اس لیے ہے کہ شاعر کو واقعۂ کربلا کی جس عظمت وجلالت کا احساس ہے وہ فکر وشعور کی منزلوں سے گزر کر اس کے ہاتھ آیا ہے، مثال کے طور پر اس بند کے چھ مصرعوں پر غور کیجیے۔

جس نے امورِ خیر کو بخشی حیاتِ نو　　جس کی نوائے درد میں ہے زندگی کی رو
صدیوں سے جس کے نقشِ قدم دے رہے ہیں ضو　　جو سوگیا بڑھا کے چراغِ وفا کی لو
بدلی عمل کی شکل ارادے بدل دیے
جس نے مطالبات کے جادے بدل دیے

یہاں کسی واقعہ کا بیان مقصود نہیں ہے، کسی مخصوص حادثے کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ جس کے سامنے شروع سے آخر تک سارا واقعہ کربلا نہ ہو، امام حسینؑ کی قربانی کا مقصد پیش نظر نہ ہو، تاریخ عالم پر اس کے اثرات کا علم نہ ہو، سوال بیعت اور اس کے جواب کے انوکھے پن پر نگاہ نہ ہو، وہ اس بند کے مضمرات سے پوری طرح لطف اندوز اور متکیف نہیں ہوسکتا۔ اسی کو میں فکری عنصر کہتا ہوں جو قدیم مراثی میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

یا اس بند پر غور کیجیے

کچھ حُسن کی نمود تھی کچھ عشق کا مزاج　　آیا نظر جو صبر و شجاعت کا امتزاج
حق نے رکھا شہادتِ عظمیٰ کا سر پہ تاج　　ملتا ہے آنسوؤں کا جسے آج تک خراج
منھی میں تھا لیے ہوئے موت اور حیات کو
کس دبدبے سے فتح کیا کائنات کو

یہ امام حسینؑ کی ظاہری شکست میں چھپی ہوئی باطنی فتح کے پیش کرنے کا انوکھا انداز ہے یہاں بھی واقعات و حادثات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ کسی مخصوص موقع کا بیان نہیں ہے لیکن شہادتِ حسینؑ نے جو نتائج پیدا کیے تھے، ان کا احساس ہے اور وہی احساس عقیدے کی گرمی کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ اسی طرح مختلف بندوں میں الگ الگ تاثر پاروں نے مرثیے کی فضا پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس پیام کو بھی اجاگر کردیا ہے جو اس زبردست قربانی میں مضمر تھا۔

جناب نجم نے اس مختصر مرثیے میں اس بات کا التزام رکھا ہے کہ جگہ جگہ پر واقعات کا تسلسل بھی برقرار رہے تاکہ مرثیے سے جو ذہنی اور جذباتی وابستگی ہے، وہ بھی آسودہ ہوتی رہے، لیکن ایسے مواقع پر انھیں غیر معمولی اختصار سے کام لینا پڑا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر انصارِ حسینؑ کی قربانیوں کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد ہی چند اعزا کا ذکر ہے اور اسی ترتیب سے ہے جیسے عام طور پر مرثیہ نگار پیش کرتے رہے ہیں، لیکن پھر یہاں یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان بندوں میں بیان واقعہ کے بجائے تاثرات ہی کے اظہار سے کام لیا گیا ہے۔ مختصر مرثیے میں اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن بھی نہیں تھی۔ جہاں انصار کا تذکرہ آتا ہے، وہاں پہلا ہی بند شاعر کے مقصد کا

ترجمان بن جاتا ہے۔

کیا ربط آج موت کو ہے زندگی کے ساتھ　　کتنے ادا شناس ہیں سبطِ نبی کے ساتھ
پھر یہ ہجومِ شوق نہ ہوگا کسی کے ساتھ　　مرنے کو یوں نہ جائیں گے انساں خوشی کے ساتھ

سن کر سفیرِ مرگ کے قدموں کی آہٹیں
ہونٹوں پہ جمع ہوں گی نہ پھر مسکراہٹیں

اس میں انصارِ امامؑ کے شوقِ شہادت، عرفانِ حقیقت، جذبۂ مودت، وفورِ شجاعت کے متعلق کتنے لطیف اشارے یکجا کر دیے گئے ہیں۔ اس بند کا پڑھنے یا سننے والا اگر امامؑ کے اصحاب سے واقف ہو، تو اس کی نگاہ تصور کے سامنے نہ جانے کتنے واقعات آجائیں گے۔

اس طرح کے مرثیے میں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ اس کے سارے مضمرات اور رموز و نکات کو وہی لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنھیں واقعۂ کربلا کا تفصیلی علم ہے۔ محض چونکا دینے والے واقعات آتے ہیں، واقعہ کی تصویر نگاہوں کے سامنے نہیں آتی لیکن غالباً اس مرثیے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کے پڑھنے اور سننے والوں کے دل میں واقعہ کی تفاصیل، عظمت اور اہمیت کے جاننے اور سمجھنے کے لیے کرید پیدا ہو۔ بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس مرثیے کا ہر بند غور و فکر کے لیے نئے دروازے کھولتا ہے اور کو قدیم کلاسکی مرثیوں کے مقابل میں اس طرح کے نئے مرثیوں میں وہ حُسنِ تعمیر نہیں ہوتا جس سے مرثیے نے عظمت حاصل کی تھی لیکن جدید مرثیے موجودہ دور کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی جگہ ادب میں محفوظ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس مرثیے کو نہ صرف عقیدت مندوں کے حلقے میں مقبولیت حاصل ہوگی بلکہ اس کا ادبی حسن، شاعرانہ خلوص اور فنکارانہ بیان اس کا مطالعہ کرنے والوں کے دائرے کو وسیع کر لے گا۔ اور اس سے وہ مقصد پورا ہوگا جو شاعر کے پیشِ نظر یعنی لوگوں میں واقعۂ کربلا کے متعلق غور و فکر کا وہ جذبہ پیدا ہو جس کا تعلق اس کے روح پرور اور جاں فزا پیام سے ہے۔

○

مرثیہ

معراجِ فکر

ع: صورت گرِ جلالتِ اسلام ہے حسینؑ

73 بند

تصنیف 1959ء

علامہ کے غیر مطبوعہ مرثیہ کے چند بند (بخط نجم آفندی)

(1)

صورت گرِ جلالتِ اسلام ہے حسینؑ
اک مرکزِ روابطِ اقوام ہے حسینؑ
فکر و نظر مشیت و الہام ہے حسینؑ
محبوبِ اہل درد بس اک نام ہے حسینؑ
دریا مخالفت کے چڑھے اور اُتر گئے
باقی رہا یہ نام حوادث گزر گئے

(2)

انسانیت کو جس نے سنوارا ہے وہ حسینؑ
جو حُسنِ معنوی کا سہارا ہے وہ حسینؑ
جس نے دلوں میں درد اُبھارا ہے وہ حسینؑ
روحِ بشر کو جس نے پکارا ہے وہ حسینؑ
آواز جس کی دُور کے انسان تک گئی
بجلی سی سامعہ کی فضا میں چمک گئی

(3)

خود دار زندگی کا جو حامی ہے وہ حسینؑ
عزّت کی موت کا جو پیامی ہے وہ حسینؑ
جو خالقِ شعورِ عوامی ہے وہ حسینؑ
ہر قوم کی نظر میں گرامی ہے وہ حسینؑ
واقف نہیں بشر جو پیمبرؐ کے نام سے
مانوس ہیں حسین علیہ السلام سے

(4)

آئینہ ہے جبینِ ازل جس کا وہ حسینؑ
ممکن نہیں جہاں میں بدل جس کا وہ حسینؑ
ہے گیسوئے حیات میں بل جس کا وہ حسینؑ
حُسن آفریں ہے دخل و عمل جس کا وہ حسینؑ
ہر منزل اس کی منزلِ صبر آزما بنی
مکہ بنا مدینہ بنا کربلا بنی

(5)

معراجِ فکر جس کی ہر اک بات وہ حسینؑ
قرآں کی شرح جس کے ہیں حالات وہ حسینؑ
جس کے تصوّرات ہیں آیات وہ حسینؑ
ممکن ہیں جس کے آگے محالات وہ حسینؑ
جس کی وغا نہ وقت کے اسرار حل کیے
صدہا برس کے عقدۂ دشوار حل کیے

(6)

جو حق کی معرفت کا ہے مفہوم وہ حسینؑ
جس کا خیال و خواب ہے معصوم وہ حسینؑ
جس کے ثباتِ عزم کی ہے دھوم وہ حسینؑ
جس کا ہے نام قوتِ مظلوم وہ حسینؑ
مظلومیت کو عزم دیا حوصلہ دیا
اظہارِ حق کا جس نے سلیقہ سکھا دیا

(7)

اقدام جس کا سب سے نرالا ہے وہ حسینؑ
جو غم کی تیرگی کا اُجالا ہے وہ حسینؑ
ملّت کا جو سنبھالنے والا ہے وہ حسینؑ
جو فاطمہؑ کی گود کا پالا ہے وہ حسینؑ
دوشِ پیمبریؐ پہ جو معراج پا گیا
جو زیرِ تیغ اتنی بلندی سے آ گیا

(8)

جو آج بھی ہے رہبرِ افکار وہ حسینؑ
ذہنوں کو کر رہا ہے جو بیدار وہ حسینؑ
دنیا تھی جس کے درپئے آزار وہ حسینؑ
اب بھی بہت ہیں جس کے گنہگار وہ حسینؑ
جس نے دیا ہے درسِ عمل حق کی راہ میں
ہم جیسے بے عمل بھی ہیں جس کی نگاہ میں

(9)

جس کی نگاہ قوم کی فکر و نظر پہ ہے
جس کی نگاہ مصرفِ ہر خیر و شر پہ ہے
جس کی نگاہ اپنے لہو کے اثر پہ ہے
جو بے خبر ہے اس پہ نہیں با خبر پہ ہے
امروز ہے نگاہ میں فردا ہے سامنے
ایک ایک فردِ قوم کا چہرا ہے سامنے

(10)

جس نے امورِ خیر کو بخشی حیاتِ نو
جس کی نوائے درد میں ہے زندگی کی رَو
صدیوں سے جس کے نقشِ قدم دے رہے ہیں ضو
جو سوگیا بڑھا کے چراغِ وفا کی لَو
بدلی عمل کی شکل ارادے بدل دیے
جس نے مطالبات کے جادے بدل دیے

(11)

تاریخِ روزگار پہ تنقید جس نے کی
ہر اک غلط اصول کی تردید جس نے کی
قدرت کے نظم و ضبط کی تائید جس نے کی
اسلام کے پیام کی تجدید جس نے کی
پھر بڑھ چلا تھا زور جو باطل کا گھٹ گیا
پردہ سا ایک روئے حقیقت سے ہٹ گیا

(12)

جس نے کیے مقاصدِ صبر و رضا بلند
جس نے کیے معانیِ حرفِ وفا بلند
جس نے کیے منازلِ درو آزما بلند
ممنون سب اسی کے ہیں کیا پست کیا بلند
منعم کو شکرِ نعمتِ حق کا سبق دیا
جس نے غریب قوم کو جینے کا حق دیا

(13)

بگڑی ہوئی تھی صورتِ دنیائے آب و گِل
چہروں پہ رنگ و روپ تھا روحیں تھیں مضمحل
وہ خبثِ نفس تھا کہ شرافت تھی منفعل
اخلاق کے نظام میں اغراض تھے مخل
خود داریِ حیات کی پائندگی نہ تھی
جینے کو جی رہے تھے مگر زندگی نہ تھی

(14)

زندہ کیے حسینؑ نے اسلام کے اصول
اُس نے عوض نبیؐ کے شہادت بھی کی قبول
مستجمع الصفات ہوئے اس طرح رسولؐ
ادراک دم بہ خود ہوں کہ حیران ہوں عقول
اک آیۂ جلی ہے یہ سرِّ خفی نہیں
منصب تو ہے نبیؐ کا اگر وہ نبیؐ نہیں

(15)

وہ عارفِ جلیل تھا آگاہِ رسم و راہ
جو کہہ گیا حسینؑ کو بنیادِ لا الٰہ
اسلام دینِ مصطفویؐ ہے خدا گواہ
لیکن اک اہلِ دل نے کہا یہ بہ اشک و آہ
کہنے میں بات آتی ہے چُپ کیوں رہے کوئی
برحق ہے اب جو دینِ حسینؑ کہے کوئی

(16)

ہر قوم میں ہے جس کی شہادت کا احترام
دُنیا میں جس کا نام ہے اک مستقل پیام
اس درجہ اس کا ذکر ہے مقبولِ خاص و عام
ہر اک زباں کے شعر و ادب میں ملا مقام
تقریر و نظم و نثر کی کچھ انتہا نہیں
اب تک کسی کا تذکرہ اتنا ہُوا نہیں

(17)

جس کی وِلا میں ہیں لبِ انسانیت پہ بین
ہر عہد میں بلند ہے آوازِ شورو شین
لاکھوں عزا کو اس کی سمجھتے ہیں فرض عین
ہر روز ہے کہیں نہ کہیں مجلسِ حسینؑ
اس شان کا غم اور مثالی نہیں کوئی
لمحہ بھی اس کے ذکر سے خالی نہیں کوئی

(18)

صدیوں سے جس کی مدح سرائی کا دَور ہے
ہر دَور میں یہ مسئلۂ فکر و غور ہے
اس باب میں سکوت طبیعت پہ جَور ہے
محرومِ درد ہو کوئی یہ بات اور ہے
جو اہلِ دل ہے دست نگر کربلا کا ہے
ہر ملک کے ادب پہ اثر کربلا کا ہے

(19)

توریت میں بھی جس کی شہادت کا ہے بیاں
ہوتا ہے کچھ زبور سے بھی ماجرا عیاں
انجیل بھی ہے جس کے منازل کی ترجماں
یہ جملہ انبیاؑ کے صحائف ہیں ہم زباں
تنظیمِ کائنات کا قلبِ صمیم ہے
قرآن میں وہ معنیِ ذبحِ عظیم ہے

(20)

جو ظلم کر رہے ہیں علوم و فنون پر
غدّار متحد ہیں حقائق کے خون پر
تصنیفِ ابنِ تیمیہ و خلدون پر
کیا تبصرہ کرے کوئی ان کے جنون پر
اُس عہد میں نہ تھے یہ تقاضے اِسی کے ہیں
یہ بھی شریک خون میں سبطِ نبیؐ کے ہیں

(21)

بے امتیاز مذہب و ملّت ہے جس کا سوگ
اکثر مٹادیا ہے تعصّب کا جس نے روگ
کتنے ہیں اب قریب بہت دور تھے جو لوگ
نامسلموں نے عشق میں جس کے لیا ہے جوگ
بھارت نواسیوں کو خطاب اک نیا دیا
کتنے برہمنوں کو حسینیؑ بنا دیا

(22)

حیرت میں عقل اس کے نظامِ عمل پہ ہے
حق بیں نگاہ حُسن دوامِ عمل پہ ہے
دل بے قرار دردِ پیامِ عمل پہ ہے
کتنا بلند اپنے مقامِ عمل پہ ہے
قوموں کے رہبروں کو ہے فخر انتساب سے
سب نور لے رہے ہیں اسی آفتاب سے

(23)

حاصل یہ جس کے غم کو ہوئی عظمتِ گراں
قیدِ زماں ہے اور نہ پابندیِ مکاں
اب تک جو ہے محبتِ برحق کا ترجماں
خود واجب الوجود ہے جس کا نگاہباں
ہر غم کا زور چار ہی اشکوں میں بہہ گیا
یہ غم جہاں میں حق کی اشاعت کو رہ گیا

(24)

آدمؑ نے کی ہے نشرِ حقیقت کی ابتداء
یہ سلسلہ ازل سے ہے تاختمِ انبیاءؑ
کیا کیا پیمبروں نے دکھایا ہے حوصلہ
پر تکملہ حسینؑ کی تبلیغ نے کیا
جاری ہے اُس کے بعد بھی پیغام آج تک
غم اُس کا کر رہا ہے وہی کام آج تک